ہمارا بگاڑ اور اس کا علاج

(نجات اللہ صدیقی۔م)

قوموں کے لئے سب سے مہلک چیز جمود اور غفلت ہے۔ جب کسی قوم کے افراد سوچنا چھوڑ دیں، حالات کا جائزہ لینے اور خرابیوں کا علاج تلاش کرنے کی طرف سے لاپروائی برتنے لگیں اور ایک بار جس راہ پر چل پڑیں آنکھیں بند کر کے اسی راہ پر چلتے رہیں تو بگاڑ کا پیدا ہونا اور بڑھنا ایک لازمی امر ہے۔ ایسی قوم میں کسی خرابی کے دور کئے جانے یا سدھار کی طرف کوئی قدم اٹھائے جانے کی بھلا کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ سدھار اور بناؤ کا انحصار بڑی حد تک اس بات پر ہے کہ ہم میں کا ہر ہر فرد کس حد تک اس بات کا فکرمند ہے کہ سماج کو بگڑنے سے بچایا جائے، اس کو بُرے رجحانات سے محفوظ رکھا جائے اور تباہی و ہلاکت کی طرف لے جانے والے نظریات و اعمال کو اس میں جگہ پانے کا موقع نہ دیا جائے

عام حالات میں بھی ملک کی فلاح و بہبود اسی سے وابستہ ہے کہ لوگ اس سلسلہ میں سوچتے رہیں اور مناسب تدبیریں اختیار کرتے رہیں، لیکن اس وقت ہمارا ملک جس مرحلہ میں ہے اس میں تو اس کی اہمیت اور بھی بڑھی ہوئی ہے۔ عرصہ تک ہمارا ملک غلام رہا ہے۔ غلامی کی سب سے بڑی لعنت یہ ہوتی ہے کہ آپ اگر ملک کی بہتری اور ترقی کے لئے کچھ سوچیں بھی تو اس کو عمل میں لانا آپ کے بس میں نہیں ہوتا۔ ایک بیرونی طاقت ملک کے سیاہ و سپید کی مالک ہوتی ہے اور آپ ملکی تعمیر و ترقی کا بہتر سے بہتر نقشہ سوچ کر بھی ملک کو عملاً کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ آزادی کی سب سے بڑی برکت یہی ہوتی ہے کہ ہم ملک کی تعمیر جس نقشہ کے مطابق چاہیں کر سکتے ہیں۔ جس نظامِ زندگی کو چاہیں نافذ کر سکتے ہیں، جن قدروں کو چاہیں سماج میں رواج بخش سکتے ہیں اور اپنے معاشرہ کو جن صفات سے مُزیّن کرنا چاہیں نظامِ تعلیم اور نشر و اشاعت کے دوسرے ذرائع سے کام لے کر ان کو پیدا کر سکتے ہیں۔ یہ آزادی کی نعمت ہمیں ابھی چند سال ہوئے ملی ہے۔ ہم نے اس کے بعد کچھ سوچا اور ملک کے نظام

زندگی میں کچھ ترمیم و تبدیلی کی۔ ایک نیا دستور بنایا، مادّی تعمیر و ترقی کے لیے پنج سالہ منصوبہ تیار کیا اور کسی حد تک اس کے مطابق کوشش بھی کر رہے ہیں۔ بلاشبہ یہ اچھی علامتیں ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم غافل نہیں ہم جمود کا شکار نہیں لیکن اس بات کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے کہ اب ہم سوچنے اور غور کرنے میں ڈھیل نہ برتنے لگیں۔ یہ سوچ کر کہ اب ایک نقشہ بن گیا اور ہم ایک ڈگر پر چل پڑے چین سے بیٹھ نہ رہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم سدھار اور بناؤ کی فکر چھوڑ دیں اور چھوٹی چھوٹی فکروں میں اپنے کو اُلجھا لیں۔ یہی تو وہ وقت ہے جب ہم کو سوچنا چاہئے کہ ہم نے جو نقشہ پسند کیا وہ کیسے نتائج سامنے لا رہا ہے۔ آزادی سے قبل ملک میں جو خرابیاں تھیں ان کے علاج کے لئے ہم نے جو تدبیریں کیں وہ کس حد تک کامیاب ہو رہی ہیں، اور ترقی و تعمیر کی جو اُمیدیں ہم نے موجودہ نظام زندگی سے وابستہ کر رکھی ہیں اُن کے کچھ آثار نظر آ رہے ہیں کہ نہیں۔

میں سمجھتا ہوں کہ آپ سب اس سوچ بچار کو کرنے کا کام قرار دیں گے اور سنجیدگی سے اس کو اپنے غور و فکر اور تبادلۂ خیالات کا موضوع بنائیں گے۔

میں بھی اس طرح کی کچھ باتیں پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔ البتہ ان کا مطالعہ اسی وقت مفید ہو سکتا ہے جب آپ خود بھی اس موضوع پر سوچیں، یوں تو اس طرف سے لاپرواہی عام ہے مگر اس سلسلہ میں مسلمانوں کا حال نسبتاً زیادہ قابل افسوس نظر آتا ہے۔ عام لوگ اگر ملکی فلاح و بہبود کے لئے کچھ سوچتے بھی ہیں تو مسلمانوں پر ایک ایسی افسردگی اور اضمحلال ساطاری ہے کہ وہ ادھر متوجہ نہیں ہوتے۔ ان میں یہ ذہنیت پرورش پا گئی ہے کہ ان کا اسی طرح کا فکر کرنا کچھ مفید نہیں ہو سکتا۔ ان کی زیادہ سے زیادہ پرواز بس اپنے قومی مسائل اور قومی تحفّظ و بقا کی تدبیروں تک محدود ہے۔ اس ذہنیت کو پیدا کرنے کی ذمہ داری کن عوامل پر ہے، اس کا جائزہ لینا ایک تکلیف دہ کام ہے۔ لیکن یہ صورت حال کسی طرح پسندیدہ نہیں قرار دی جاسکتی۔ یہ بات ایک مسلمان کی پوزیشن سے بالکل گری ہوئی ہے کہ وہ جس ملک میں رہتا ہو اسی کے اجتماعی مسائل اور اسی کی فلاح و بہتری سے دلچسپی لینا صرف اس لئے چھوڑ دے کہ سیاسی طور پر اس کا یہ سوچنا زیادہ اثر نہ دکھا سکے گا۔ خود یہ خیال بھی سراسر غلط ہے۔ انسان کتنے ہی گروہوں اور قوموں میں بٹ گیا ہو لیکن اچھی بات اور خیر خواہانہ رائے اپنا مقام پیدا کر لیتی ہے۔

شرط یہ ہے کہ خود ہمارا طرزِ فکر درست ہو اور ہم مسائل پر ۔۔۔۔ قوم پرستانہ اور فرقہ پرستانہ نقطۂ نظر سے نہ غور کریں
تمام انسانوں کا بھلا ایک ہی راہ میں ہو سکتا ہے یہ بالکل غلط خیال ہے کہ کسی خاص گروہ کی فلاح و کامرانی کی راہ بقیہ
انسانوں کی راہ سے کٹ کر الگ جاتی ہے۔ ہندو اور مسلمان، سکھ اور عیسائی سب کا بھلا ایک ہی راہ میں
ہو سکتا ہے یہ بات اس کائنات کے نظام اور فطرت کے مزاج سے ٹکراتی ہے کہ مختلف گروہوں کا بھلا
الگ الگ راہوں سے وابستہ ہو۔

ملک کی موجودہ صورتِ حال

اب ہمیں ملک کی موجودہ صورتِ حال کا جائزہ لینا ہے اور یہ معلوم کرنا ہے کہ ملک میں اچھائی زیادہ
ہے یا برائی۔ اور یہ کہ سماج بناؤ اور بہتری کی طرف بڑھ رہا ہے یا بگاڑ اور ابتری کی طرف۔ اس جائزہ میں ہمیں
یہ بات ہر لمحہ اپنے سامنے رکھنی چاہئے کہ بناؤ اور بگاڑ کا اصل معیار مادّی پیداوار میں اضافہ یا مادّی حالات کی
بہتری نہیں۔ جو چیز فیصلہ کن ہوتی ہے وہ افراد کی اخلاقی حالت ہے۔ لوگوں کا اخلاق کیسا ہے۔ دیانتداری
احساس ذمہ داری اور ادائے فرض کی صفات اُن میں کس حد تک پائی جاتی ہیں عفّت و عصمت اور پاکبازی
اپنے ہی جیسے دوسرے انسانوں کی عزت و آبرو اور جان و مال کا احترام بلکہ ان کے ساتھ ہمدردی و تعاون
کی اسپرٹ لوگوں میں کس حد تک موجود ہے۔ پھر یہ کہ ملک کے باشندوں میں اتحاد و یکجہتی ہے کہ انتشار
و افتراق نے اس کی جگہ لے لی ہے۔ اور یہی باتیں اصل اہمیت کی حامل ہیں البتہ ان کے ساتھ ہی ہم کو یہ بھی دیکھنا ہوگا
کہ معاشی اعتبار سے ملک کا کیا حال ہے۔ دولت کی پیدائش میں ترقی ہے کہ تنزّل۔ عوام کس حال میں
ہیں اور دولت کی تقسیم منصفانہ طور پر ہو رہی ہے کہ نہیں، معاشی اعتبار سے بھی اصل اہمیت کی حامل یہی
آخری چیز ہے اس لیے کہ دولت کی پیدائش میں کتنا ہی اضافہ کیوں نہ ہو جائے اگر دولت کی تقسیم ظالمانہ
اور غیر منصفانہ طریقہ پر ہی ہوتی رہے تو اس سے خرابی ہی میں اضافہ ہوتا ہے، بہتری نہیں پیدا ہوتی۔
ان باتوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے جب ہم ملک کی موجودہ صورتِ حال کا تجزیہ کرتے ہیں تو ہم کو
بگاڑ زیادہ اور بناؤ کم نظر آتا ہے۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر لمبے چوڑے ثبوت درکار ہوں بلکہ ایسے

ہم آپ اپنی روزانہ زندگی ہی میں محسوس کرتے رہتے ہیں کہ حالات بحیثیت مجموعی بہتری کی طرف نہیں جا رہے ہیں۔ بلاشبہ بعض بعض باتوں میں کچھ بہتری پیدا ہوئی ہے لیکن خرابیوں میں اتنا زیادہ اضافہ ہوا ہے کہ ملک بہتری اور سدھار کی طرف جانے کے بجائے تباہی کی طرف ہی بڑھتا ہوا نظر آتا ہے۔ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ہم خاص خاص خرابیوں کو آپ کے سامنے گنائیں اور ان کے سلسلہ میں ذرا گہرائی میں اتر کر دیکھیں کہ وہ کیوں پیدا ہو رہی ہیں۔ ایسا کرنے کے بعد ہی ہم صحیح علاج تجویز کر سکیں گے۔

غور سے دیکھئے تو آج کی اصل اور بڑی بڑی خرابیاں تین ہیں۔

اخلاقی گراوٹ

سب سے زیادہ اہم، نمایاں اور دور رس اثرات رکھنے والی خرابی وہ عام اخلاقی انحطاط ہے جس کے مظاہر چار سو بکھرے ہوئے ہیں۔ ان مظاہر کا احاطہ کرنا مشکل ہے لیکن سرسری نظر سے بھی اگر ان کو دیکھا جائے تو دل پر ہول طاری ہو جاتا ہے۔ اتنی ساری خرابیاں آخر کہاں سے آئیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کے اندر کوئی بنیادی خامی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ خامی کیا ہے، اس کا جواب ہم کو غور کے ساتھ ان مظاہر کے مطالعہ سے ہی مل سکتا ہے۔ آئیے ان میں سے چند کا یہاں بھی جائزہ لیں۔

ابھی پچھلے دنوں (اکتوبر نومبر ۱۹۵۲ء یا اس کے لگ بھگ) آپ نے ملک کے کئی ہونہار سپوتوں کے وہ خطابات سُنے ہوں گے یا اخبارات میں ان کی رپورٹ پڑھی ہوگی جو اُنھوں نے کالجوں اور یونیورسٹیوں سے ڈگری حاصل کرنے والے نوجوانوں سے کئے تھے۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن، شری راج گوپال آچاریہ اور بابو راجندر پرشاد جیسے سمجھ دار لوگوں نے آج کے تعلیم یافتہ نوجوانوں کی اخلاقی حالت کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا تھا وہ آپ کو یاد ہی ہوں گے، مگر آپ کو ان کے تاثرات کی کیا ضرورت، آپ خود دن رات ان تعلیم یافتہ لوگوں کے اخلاق و عادات کا مطالعہ کرتے رہے ہیں۔ بلکہ ہم میں سے اکثر اسی گروہ سے تعلق بھی رکھتے ہیں۔ ہمارا نظام تعلیم بارہ بارہ سال اور چودہ چودہ سال جن لوگوں پر محنت صرف کرتا ہے ان کی اخلاقی حالت کیا ہوتی ہے۔ عفّت و عصمت شرم و حیا۔ دوسروں کے حقوق کا احترام، اپنے فرائض کا احساس، ملک کو ترقی دینے اور انسانیت کی بہتری کی خاطر ایثار و قربانی۔

کا جذبہ ـــــ ان مطلوبہ صفات کے سلسلہ میں ان کا کیا حال رہتا ہے ۔ ان کی فکر کے اہم ترین موضوعات
کیا رہتے ہیں ۔ انسانیت کی فلاح وبہبود ۔ عریاں فلمیں اور فلمی ستاروں کے جسم ولباس ! ان سب کے
سلسلہ میں تفصیلات میں جانے کی ضرورت نہیں آپ کو بخوبی اندازہ ہوگا ۔

اور یہ صورت حال کوئی طالب علموں کے ساتھ مخصوص نہیں ۔ ان کا الگ سے ذکر تو میں نے صرف اس لیے
کیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کی اخلاقی تربیت ہمارے نظام تعلیم کے زیر نگرانی ہو رہی ہے اور اس طبقہ کے اخلاقی
انحطاط کے سلسلہ میں ملک کے ذمہ دار لوگوں کی رائے کا حوالہ بھی میں نے اس لئے دیا کہ اس سے ہمارے
اپنے سوچے ہوئے نقشہ کار ، نظام تعلیم اور نظام زندگی ، کی بابت رائے قائم کرنے میں بھی آسانی ہوگی اس لئے
کہ یونیورسٹی کے گریجویٹ اس کے براہِ راست ثمرات میں سے ہیں ۔ ان کے علاوہ ، عام لوگوں کا حال
بھی اچھا نہیں بلکہ دن بدن برا ہی ہوتا جا رہا ہے ۔ فحاشی پہلے کی بہ نسبت بڑھ رہی ہے ۔ عریانی بھی اب
زیادہ پسند کی جاتی ہے ۔ حسن کے مقابلوں اور عریاں فلموں کے ذریعہ رہی سہی شرم وحیا کو بھی مٹایا جا رہا ہے
سینما کی بڑھتی ہوئی بے راہ روی کا اندازہ آپ اسی سے بھی کر سکتے ہیں کہ ابھی پچھلے سال مرکزی حکومت کے
ذمہ دار وزیر ، ڈاکٹر کیسکر کو فلم سازوں کو یہ ڈانٹ بتانی پڑی تھی کہ ہالی ووڈ کی تقلید میں فلموں کی بڑھتی ہوئی
عریانی وفحاشی ناپسندیدہ ہے ۔ اس وقت ہمیں اس سے بحث نہیں کہ امریکن نظام زندگی کی قدم بہ قدم تقلید کے
ساتھ فلم سازوں کو ہالی ووڈ کی تقلید سے روکنے کا وعظ کتنا پُر اثر ہو سکتا ہے ہم تو صرف یہ دکھانا چاہتے ہیں
کہ خرابی کتنی بڑھ چلی ہے ، فلم اور ریڈیو کے ساتھ اس بے لگام اَدب کے اثرات کو بھی شامل کر لیجئے جو لوگوں
کی جیب سے پیسے نکالنے کی خاطر گندہ سے گندہ مواد ذہنوں میں اُتارتا رہتا ہے ۔ ہر مہینہ سیکڑوں کی تعداد میں
نکلنے والے کثیر الاشاعت رسائل جنسیت اور شہوانیت سے لبالب افسانے ، ڈرامے اور نظمیں لئے گھر گھر
پہنچ جاتے ہیں اور بچوں ، بوڑھوں سبھی سے داد ..... حاصل کرتے ہیں ۔ بڑے ہی افسوس کی بات ہے
کہ اب اس طرح کے رسالے ان دوشیزاؤں کے مطالعہ کا بھی واحد سامان بنتے جا رہے ہیں جن کی پاکیزگی فکر
اور سلامت روی ہی سے ملک کے حال ہی نہیں مستقبل کا دامن بھی وابستہ ہے ۔

ان چیزوں کے نتیجہ کے طور پر معاشرتی فضا کی گندگی بڑھ رہی ہے ۔ جنسی اخلاق گر رہا ہے ۔ عدالت

تک پہنچ جانے والی زنا بالجبر کی وارداتوں کی تعداد بڑھ رہی ہے عصمت فروشی روزافزوں ہے۔ آپ کے اپنے صوبے میں اور پورے صوبہ کو چھوڑیئے صرف لکھنؤ میں عصمت فروشی کی وبا جس طرح بڑھ رہی ہے اس سے آپ اخبارات کے ذریعے واقف ہوں گے، دہلی کے سلسلہ میں جو اطلاعات اخبارات میں آتی رہتی ہیں ان سے بھی آپ کو یہ اندازہ ہو سکتا ہے کہ ہمارے ملک میں یہ خرابی کتنی بڑھتی جا رہی ہے۔ اسی خرابی کا شاخسانہ بُردہ فروشی اور اغوا کی روزافزوں وارداتیں ہیں اور خصوصیت کے ساتھ یوپی کے پہاڑی علاقوں میں یہ وبا جو شکل اختیار کر چکی ہے وہ قابل تشویش ہے۔

یہ ہے ہماری موجودہ معاشرت کا نقشہ۔ اخلاقی خرابی کے مظاہر اس کے علاوہ بھی بے شمار ہیں۔ پچھلے دنوں چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں میں حیرت انگیز اضافہ ہوا ہے۔ اس کا سبب کیا ہے۔ بڑے نادان ہیں وہ لوگ جو محض بعض معاشی وجوہ کو اس کا واحد سبب قرار دے دیں۔ نہ تو اس خود فریبی سے کوئی فائدہ ہوگا نہ ہی اس صورت حال کے علاج کے طور پر محض پولیس کی تعداد اور قوت میں اضافہ کام دے سکے گا۔ ہمیں سنجیدگی سے سوچنا چاہیئے کہ وہ کون سی کمی ہے جو لوگوں کو زیادہ نڈر اور زیادہ دست دراز بنا رہی ہے اور دوسروں کے حقوق کے بارے میں اتنا جارحانہ رویّہ اختیار کرنے پر آمادہ کر رہی ہے۔ چوری اور ڈکیتی پر نظر ڈالتے وقت یہ بھی نہ بھولئے کہ اس کے ساتھ اور ان سے الگ ہونے والی قتل و خون کی وارداتیں بھی بڑھ رہی ہیں۔ اور ہاں یہ بات بھی سامنے رہے کہ چوری کی سیدھی سادھی شکلوں سے کم خطرناک وہ شکلیں نہیں جنہیں چاہے آپ کا قانون جائز قرار دیتا ہو لیکن وہ لوگوں کی جیبوں پر ڈاکہ ڈالنے ہی کی مہذب شکلیں ہیں۔ دھوکے دینے والے بینک اور جھوٹی اشتہار بازی کو اسی صف میں گنا جا سکتا ہے۔

چوری کی یہ شکلیں سب کو بُری لگتی ہیں لیکن اخلاقی انحطاط نے اس بھی زیادہ خطرناک چیزوں کو جنم دیا ہے جو خطرناک ہونے کے ساتھ عام بھی ہیں اور بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ سماج کا کوئی فرد ایسا نہیں جس کو برابر ان سے نقصان نہ پہنچتا ہو۔ آپ کسی بھی دفتر میں کوئی کام لے کر چلے جائیے۔ آپ کو یہی اندازہ ہوگا کہ ہمارا دفتری نظام سرے سے پیر تک رشوت خوری کا نظام بنتا چلا جا رہا ہے۔ ذمہ دار لوگوں کے بیانات سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ اس نظام دفتری کے اوپری زینوں تک بھی یہ خرابیاں پہنچی ہوئی ہیں، اور سچی بات تو یہ ہے کہ اگر اوپر خرابی نہ ہو اور اوپر کے لوگ

پوری دیانت داری کے ساتھ خرابیوں کو دور کرنا چاہتے ہوں تو ایسی خرابیاں اتنے بڑے پیمانہ پر مستقلاً موجود نہیں رہ سکتیں
بازار کے اخلاق کا حال بھی برا ہی ہے جہاں موقع ملتا ہے چور بازاری اور بے جا انتفاع سے کوئی نہیں رکتا۔ بازار، دفتر، گھر، محلہ سب ہی میں ناپسندیدہ اور نامطلوب چیزیں دیکھنے میں آرہی ہیں بلکہ انہی عناصر کا غلبہ سا ہوتا جا رہا ہے۔ اب یہ چیز اور آگے بڑھ رہی ہے۔ پچھلے دنوں مغربی یو پی کے ایک شہر کے بعض باخبر لوگوں سے میونسپلٹی کے آنے والے الکشنوں کے سلسلہ میں تبادلہ خیالات کا اتفاق ہوا۔ انھوں نے بیان کیا کہ آنے والے الکشنوں میں امیدواروں کی ایک خاصی تعداد ان غنڈوں پر مشتمل ہے جو اس حیثیت سے اچھے خاصے معروف ہیں، البتہ چونکہ روپیہ پیسہ کی افراط ہے لہٰذا ان کا منتخب ہو جانا یقینی سا ہے۔ آپ اس سے اندازہ کر سکتے کہ حالات کا رخ کیا ہے اور ہماری سماجی زندگی کس سمت میں جا رہی ہے۔

یہ وہ پہلی خرابی ہے جس کی بنیادی حیثیت اور ہمہ گیری اس بات کا تقاضا کرتی ہے کہ ہم پہلی فرصت میں اس کے اسباب پر غور کریں اور اس کا علاج سوچیں۔ چونکہ سماجی زندگی کی بہتری کا اصل انحصار فرد کی سیرت پر ہے لہٰذا ہمیں اسی بات کو بڑی تشویش کی نگاہوں سے دیکھنا چاہئے کہ اخلاقی انحطاط ہمارے سماج میں اتنے ہمہ گیر پیمانے پر رونما ہو گیا ہے۔ زندگی کا شاید ہی کوئی گوشہ ایسا ہو جہاں اخلاقی قدروں کی پامالی اور نفسانیت کی حکمرانی میں کوئی کسر رہ گئی ہو۔ ایسا کیوں ہے؟ اس صورت حال کو بدلنے کے لیے ہمیں کیا کرنا چاہیے۔
یہ وہ اہم سوال ہے جس پر ہم دوسری خرابیوں کا جائزہ لینے کے بعد غور کریں گے۔

عام انتشار

اتنے ہمہ گیر اخلاقی انحطاط کے ساتھ آج ہمارا ملک ایک عام انتشار کا بھی شکار ہو گیا ہے۔ آزادی سے پہلے بھی انتشار کو ہوا دینے والی بنیادیں موجود تھیں لیکن آزادی کی جد و جہد نے بہت سے اختلافات کو دبا رکھا تھا اور ایک طرح کی یک جہتی سی نظر آتی تھی۔ اب آزادی کے بعد فرقہ پرستی اور قوم پرستی کے علاوہ صوبائیت اور لسانی عصبیت نے سر اٹھایا ہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک طوفان سا کھڑا کر دیا ہے۔
فرقہ پرستی اور قوم پرستی جس انتشار کی غماض ہیں اور جو خطرناک نتائج سامنے لا سکتی ہیں ان کا آپ کو اندازہ ہی نہیں تجربہ بھی ہے۔ اس دنیا میں اگر کسی اختلاف کو معقول قرار دیا جا سکتا ہے اور ناپسندیدہ سمجھتے ہوئے بھی جسے بڑی حد تک ناگزیر قرار دیا جا سکتا ہے وہ محض وہ اختلاف ہے جو اصولی ہو اور نظریاتی اختلاف کی بنا پر پیدا ہوا ہو۔

اگر میں اسلامی نظام حیات کا قائل اور اس پر مائل ہوں تو مجھے بجا طور پر ایک اشتراکی سے اختلاف رکھنے،
اسے ظاہر کرنے، اور اس کی بنا پر اشتراکی کے ساتھ اپنے تعلقات اور سلوک کو متعین کرنے کا حق حاصل ہے۔
لیکن فرقہ واریت اور قوم پرستی کی منطق ہی دوسری ہے۔ یہاں ایک شخص دوسرے سے صرف اس لئے اختلاف ہی
نہیں بلکہ دشمنی رکھتا ہے کہ وہ دوسرے نسلی گروہ سے تعلق رکھتا ہے یا کچھ دوسرے طرز کی رسوم ورواج کا پابند ہے۔
اصولی اختلاف کا تو ایک خاصّہ یہ بھی ہے کہ وہ معقولیت کی حدود کا پابند ہوتا ہے سچا اصولی اختلاف کبھی انسانوں
سے نفرت نہیں سکھاتا۔ غلط اصولوں سے نفرت کے ساتھ وہ ان کے حاملین سے ہمدردی کی تعلیم دیتا ہے،
اور ان کی بہی خواہی کا یہ تقاضا بتاتا ہے کہ ان کو غلط نظریات کے بندھن سے آزاد کیا جائے لیکن قوم
پرستی اور فرقہ پرستی کا آغاز ہی نفرت سے ہوتا ہے۔ یہاں بلاکسی معقول اصولی اختلاف کے حریف اور مقابل فریق
سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے اس نفرت کے ثمرات ہندوستان اچھی طرح چکھ چکا ہے لیکن اب بھی فرقہ پرستی زندہ
ہے، اس کو زندہ رکھنے والے اور بھڑکانے والے موجود ہیں بلکہ ایسی سیاسی تنظیمیں بھی موجود ہیں جو فرقہ
پرستانہ نقطۂ نظر سے سوچتی ہیں اور سوچنا سکھاتی ہیں۔ یہیں تک بس نہیں۔ بعض قومی جماعتیں بھی جو اپنی
طویل تاریخ کو فرقہ پرستی کے داغ سے پاک قرار دینے اور اس سلسلہ میں اپنی مدح سرائی کرنے میں کبھی نہیں
تھکتیں، فرقہ پرستانہ نقطۂ نظر سے متاثر ہوتی جا رہی ہیں اور اب انھیں اس سلسلہ میں زیادہ سے زیادہ
دوسروں کے مقابلہ میں کچھ غنیمت قرار دیا جا سکتا ہے اور بس۔ جو قوم پرستانہ تحریکیں اپنی موت آپ مر چکی
تھیں اب ان کے بھی احیاء کی کوششیں شروع ہو گئی ہیں جس طرح پہلے نعرہ بازی اور جذباتی ہیجان
انگیزی کے سہارے تحریکیں چلا کر مختلف فرقوں کو محض ایک دوسرے کے مقابلے اور دشمنی میں منظم کیا گیا
تھا اب ایک بار پھر اس انداز سے سوچا جا رہا ہے یہ صورت حال بڑی تشویش ناک ہے۔

فرقہ پرستی کی تفریق پیدا کرنے والی لعنت کی تباہ کاریوں سے ابھی ملک نے نجات بھی نہیں پائی تھی
کہ صوبائی اور لسانی تعصب زور پکڑ گیا۔ بنگال وبہار کے درمیان صوبائی تعصب ترقی ہی کرتا جا رہا ہے اور اب
عام آدمیوں سے نکل کر یہ مباحث چوٹی کے لوگوں کا موضوع فکر بنتے جا رہے ہیں۔ مختلف لسانی گروہ اپنے
کو الگ کلچر کا حامل بتانے لگے ہیں اور اس بنا پر اپنے کو اس بات میں حق بجانب قرار دیتے ہیں کہ وہ الگ صوبہ

کا مطالبہ کریں۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ ابھی کون کون سی عصبیتیں سر اُٹھانے کے لئے مناسب موقع کی منتظر ہیں اور یہ علٰحدہ پسندانہ رجحان کس منزل تک پہنچنا چاہتا ہے اور سب سے بڑی تکلیف دہ بات تو یہ ہے کہ نہ صرف یہ کہ نت نئے اختلافات جنم لے رہے ہیں بلکہ وہ بہت جلد مختلف گروہوں کو ٹکرا دیتے ہیں اور فتنہ و فساد کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

معاشی ناہمواری اور بدحالی تیسری بڑی خرابی موجودہ معاشی بدحالی اور معاشی ناہمواری ہے۔ باوجود اس کے کہ آزادی کے بعد سے سب سے زیادہ کوششیں اسی سمت میں کی گئی ہیں اور اسی خرابی کو ساری سماجی و اخلاقی و معاشرتی خرابی کی جڑ سمجھ کر اس پر سب سے زیادہ قوت صرف کی گئی ہے، حالات کچھ زیادہ بہتر نہ ہو سکے۔ بلکہ بے روزگاری بڑھ گئی ہے۔ اور بے روزگاری کتنی بڑی لعنت ہے یہ آپ خوب اچھی طرح جانتے ہیں، ایک شخص کے بے روزگار رہنے کا مطلب صرف یہی نہیں کہ اسے کھانے پینے اور پہننے کی تکلیف ہے بلکہ اس سے ایک پورے خاندان کی تعلیم، معاشرتی اخلاقی اور ملک و قوم کے لئے اس کی افادیت پر بھی برا اثر پڑتا ہے، بے روزگاری کے ساتھ اشیاء ضرورت کی گرانی اور قلت زر نے حالات کو اور خراب کر دیا ہے۔ اوپر سے ٹیکسوں کا بار بھی ہلکا نہیں ہوتا کہ عوام اطمینان کا سانس لے سکیں۔ یہ ساری خرابیاں دراصل نظام سرمایہ داری کی برکات ہیں۔ جیسا کہ ہم ابھی جائزہ لیں گے سودی نظامِ معیشت کا خاصہ یہ ہے کہ یہ ساری خرابیاں پیدا ہوں اور ان سے عوام کو تکلیف پہنچے۔ اسی کے ساتھ دوسرے سرمایہ دار ممالک کی طرح ہمارے یہاں بھی مزدور اور مل مالک کے تعلقات انتہائی کشیدہ رہتے ہیں۔ تجارت کا میدان سٹہ بازی اور دوسری سرمایہ دارانہ حرکتوں کی وجہ سے چھوٹے تاجروں کے لئے نفع بخش نہیں رہ گیا ہے، سود کی لعنت نے ہر جگہ محنت کے اوپر سرمایہ کو برتری اور فوقیت بخش رکھی ہے۔

خرابی کے اسباب اور علاج

اس جائزہ کے بعد اب ہم کو یہ سوچنا ہے کہ یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوئیں۔ کیوں بڑھ رہی ہیں اور ان کو کس طرح

دور کیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے ہم عام اخلاقی انحطاط ہی کو لیں گے۔ آپ حضرات کے سامنے اس بات پر زیادہ تفصیل سے گفتگو کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی کہ اخلاق کی پائیدار بنیاد صرف خدا پرستی اور ترجیح آخرت ہی بن سکتی ہے۔

جو چیز انسانوں کو پاکیزگی پر قائم رہنے اور عفت و عصمت، شرم و حیا اور دوسری فطری صفات کا لحاظ رکھنے پر آمادہ کرتی ہے اور انھیں اپنے فرائض کے سلسلہ میں ذمہ داری اور دوسروں کے حقوق کا احترام سکھاتی ہے وہ دراصل جواب دہی کا وہ احساس ہے جو خدا پرستی ہر انسان کے اندر پیدا کرتی ہے۔ اللہ سے ڈرنا اس کی نعمتوں کا شکر گزار ہو کر اس کی ہدایات پر جی لگا کے عمل کرنا اور آخرت کے انجام کو اہمیت دیتے ہوئے دنیوی زندگی کو امتحان سمجھ کر گزارنا یہی طرز فکر و عمل ہے جس کے بعد کسی انسان سے آپ ہر بھلائی کی توقع کر سکتے ہیں اور ہر برائی سے پاک ہونا اسکے لئے ممکن ہو سکتا ہے اس لئے کہ ان باتوں کا تعلق انسان کے دل و دماغ سے ہے اور انسان کے سارے ارادوں پر یہ چیزیں حکمراں بن کر چھا جاتی ہیں لیکن اگر یہ اپنی بنیادوں کو ذہنوں میں راسخ نہیں کرتے ناخدا شناسی اور آخرت سے لاپروائی عام رہتی ہے، لوگوں کو اپنے خالق و مالک سے نہ محبت رہتی ہے نہ خوف تو پھر کسی بھلائی کی توقع فضول ہے۔ جو شخص آخرت سے لاپروا ہوگا وہ دنیا میں اپنی خواہشات پر قابو کیسے پا سکتا ہے۔ دوسروں کے حقوق پر دست اندازی اور دوسروں کی عزت و آبرو۔ جان و مال پر ڈاکے سب نتیجہ ہوتے ہیں ان خواہشات کا جو اتنی بڑھ جاتی ہیں کہ آدمی جائز طریقوں سے انھیں پورا کر ہی نہیں سکتا۔ پھر جب آخرت میں اس دنیا کے اعمال و افعال کی جواب دہی کا انسان کو احساس ہی نہ ہو تو وہ کیوں لذتوں کی طلب میں کوتاہی کرے اور عیش کرنے سے باز رہے۔ جب کوئی بلند و برتر مقصد سامنے نہ ہو اور آخرت کی زندگی میں اللہ کی رضا طلبی کا بلند مقصود نظروں سے اوجھل ہو تو نام و نمود، غلبہ و اقتدار اور کام و دہن کی گوناگوں لذتیں آدمی کا منتہائے نظر کیوں نہ بنیں؟ بے لگامی۔ غیر ذمہ داری۔ خود غرضی اور مفاد پرستی یہ سب ناخدا شناسی کے لازمی نتیجے ہیں۔ خدا پرستی ان چیزوں کا علاج صرف نظریاتی طور پر ہی نہیں کرتی بلکہ ہمارے سامنے ایسے افراد کا نمونہ بھی پیش کرتی ہے جو ایثار و قربانی، مواساۃ و ہمدردی پاکیزگی اور ستھرائی کے اعلیٰ معیار عملاً پیش کرتے ہیں اور اس طرح ہمارے اندر بلند کردار پیدا کرنے کے باعث بنتے ہیں۔ اس کے برعکس سیکولر اور لادینی طرز فکر انسان کے سامنے گھٹیا اخلاق کے نمونے پیش کرتا ہے اور انسان کو یہ سبق پڑھاتا ہے کہ وہ اپنی خواہشات کی غلامی سے نجات نہیں پا سکتے۔

خدا پرستی کی بنیادوں کو چھوڑ کر کسی دوسری بنیاد پر اخلاق کی تعمیر ممکن نہیں۔ مسرت اور کمال، اور ”فرض برائے فرض“ کے نظریہ ہائے اخلاق دراصل فلسفیوں کی دماغی اُپج کا نتیجہ اور کتابوں کے صفحات تک محدود رکھنے والے نظریات ہیں۔ ان میں صداقت کا تھوڑا سا عنصر ضرور ہے لیکن ایک ہمہ گیر اور بلند اخلاق کبھی ان کے سہارے نہیں قائم رہ سکتا۔

اسی طرح جو لوگ قوم پرستی یا حبّ الوطنی کو اچھے اخلاق کے لئے محرّک بنانا چاہتے ہیں اور خدا پرستی کے اخراج سے جو خلا ہماری اجتماعی زندگی میں پیدا ہو رہا ہے اسے قومی ترقی و سربلندی کی منزل سامنے لاکر پُر کرنا چاہتے ہیں وہ بھی کبھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ بلاشبہ قوم و ملک کی ترقی کی خاطر لوگ بہت کچھ کر جاتے ہیں لیکن اس کی ایک حد ہوتی ہے اور اس حد تک بھی آدمی خاص حالات ہی میں جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ قومی سربلندی کا مقصد لوگوں میں جوش و جذبہ اسی وقت پیدا کرتا ہے جب قوم کے مدّمقابل کوئی دوسری طاقت بھی ہو۔ یا تو جرمنی کی طرح کوئی قوم دوسری قوموں کو ہڑپ کر جانے کا منصوبہ لے کر اٹھے یا کم سے کم دماغی طور پر ہی وہ کسی دوسری قوم کو اپنا ہدف بنائے۔ قوم پرستی اپنی زندگی اور توانائی کے لئے کسی دوسری قوم کا خون چاہتی ہے۔

آپ کسی دوسری قوم کی دشمنی میں اپنی قوم کو منظّم بھی کر سکتے ہیں۔ اس میں ڈسپلن اور سمع و طاعت کی صفات بھی پیدا کر سکتے ہیں اور اُسے قوم کی خاطر جان و مال قربان کرنے پر بھی آمادہ کر سکتے ہیں لیکن آپ کو سوچنا پڑے گا کہ کیا اپنی قوم میں یہ صفات پیدا کرنے کے لئے آپ اقوامِ عالم کے لئے ایک ڈاکو اور خونی بن کر اٹھنا پسند کریں گے۔ اور کیا یہ شکل کوئی پائدار اور دائمی شکل ہے، پھر یہ بات بھی سامنے رہے کہ عفّت و پاکبازی اور رحم و ہمدردی وغیرہ وہ صفات، جن پر روزانہ زندگی کے امن و سکون کا انحصار ہے اس بھاری قیمت پر بھی آپ کو نہیں مل سکیں گی!

سچی بات یہ ہے کہ مسرت و کمال ہو یا قومی ترقی و سربلندی کا جذبہ کوئی چیز بھی ہمہ گیر اور پائدار اخلاق نہیں پیدا کر سکتی۔ نہ ہی آج تک ان سے یہ ہو سکا اور یہی وجہ ہے کہ جتنی بھی معروف اخلاقی قدریں ہیں وہ ”فطرت“ اور ”خدا پرستی“ ہی کے سہارے قائم ہیں۔ ان بنیادوں کے علاوہ اگر اخلاق کی کچھ اور بنیادیں ہوتیں تو اُنھوں نے بھی کچھ اخلاقی قدروں کو جنم دیا ہوتا۔ چراغ لے کر ڈھونڈھنے سے بھی آپ کو کوئی ایسی قدر نہیں ملے گی۔

یہ جو انتشار و افتراق ہمیں نظر آرہا ہے اس کی وجہ کیا ہے ـــــ اس کا سیدھا سادا جواب یہ ہے کہ

کوئی ایسی چیز نہیں جو ہمیں ایک رکھ سکے۔ کوئی نقطۂ اتحاد نہیں، کوئی کلمۂ جامعہ نہیں جو مختلف زبانیں، مختلف رسم و رواج اور مختلف تمدّن رکھنے والے گروہوں کو جو جغرافیائی اعتبار سے مختلف علاقوں میں بسے ہوئے ہیں ایک رکھ سکے بلکہ ایسے نظریات و افکار رواج پا رہے ہیں جو ان مختلف گروہوں کو آپس میں لڑنے جھگڑنے پر بھی آمادہ کر دیتے ہیں۔

آزادی سے پہلے بھی کوئی کلمۂ جامعہ نہیں تھا جو ہمیں ایک رکھ سکتا لیکن آزادیٔ ہند اور پاکستان دو بڑے مقاصد نے سامنے آ کر لوگوں کو دو مختلف کیمپوں میں متحد کر دیا تھا۔ اب یہ مقاصد حاصل ہو گئے اور یہ عارضی یک جہتی ختم ہو گئی۔ اب اگر کوئی چیز سب کو ایک رکھ سکتی تھی تو وہ اصول و نظریات کی یکسانیت تھی۔ ہم زبانوں کے اختلاف کو نہیں مٹا سکتے، نہ ہی سارے علاقوں کو جغرافیائی اعتبارات سے ایک کر دے سکتے ہیں اور نہ ہی ماضی کی تاریخ کو بدل سکتے ہیں جس نے مختلف گروہوں کو مختلف رسوم رواج اور کلچر بخشے ہیں پھر یہ چیزیں بنیادی اہمیت کی حامل ہیں بھی نہیں، ایسے اختلافات ہمیشہ انسانوں میں موجود رہے ہیں لیکن پھر بھی لوگ اصولوں اور نظریات پر متفق ہو کر جمع ہوتے رہے ہیں۔ ہاں اس اتحاد کو پائدار اور دائمی بنانے کے لئے یہ ضروری ہے کہ جو اصول ہم پسند کریں وہ فطرتِ انسانی سے براہِ راست تعلق رکھتے ہوں۔ کسی عارضی صورتِ حال کے پیشِ نظر ہم کوئی خود ساختہ نظریہ اختیار کر لیں تو لوگ جمع ہو سکتے ہیں لیکن جلد ہی اس مقصد کو حاصل کر کے وہ منتشر بھی ہو جائیں گے۔ فطری، دائمی اٹل اور ناقابلِ تغیّر اصول ہی ایک دائمی اتحاد کی بنیاد بن سکتے ہیں۔ کسی اور چیز سے اس خلا کو پُر نہیں کیا جا سکتا۔ افسوس کی بات ہے کہ ہمارے لیڈروں کو اس انتشار کے علاج میں اگر کوئی بات سوجھتی ہے تو وہی "قوم پرستی" کی لعنت ہے جو خود انتشار کو جنم دیتی ہے۔ آپ خود سوچیں کہ کیا جن دلائل کی بنا پر ہندوستان کے باشندوں سے خود کو پاکستان، برما، سیلون اور دوسرے ممالک سے ممتاز ایک الگ قوم سمجھنے کو کہا جاتا ہے بعینہٖ انہی بنیادوں پر، بلکہ ان سے زیادہ ٹھوس اور وزن دار دلائل کے ساتھ کسی لسانی علاقے، مثلاً بنگال کے بسنے والوں کو یہ تعلیم نہیں دی جا سکتی کہ وہ خود کو ایک الگ "قوم" سمجھیں! قوم پرستی کی منطق اگر صحیح ہے تو یہ لاتعداد لسانی اور صوبائی عصبیتوں کے نعرے بھی صحیح ہیں اور آپ کسی طرح انہیں غلط نہیں قرار دے سکتے پس قوم پرستی دراصل خود ان عصبیتوں کو جنم دیتی ہے۔ یہ ان کا علاج کیا کرے گی پھر لطف یہ کہ ہمارے یہاں قوم پرستی کے ساتھ

سیکولرزم کا راگ بھی الاپا جاتا ہے حالانکہ سیکولرزم کوئی مثبت نظریہ ہی نہیں کہ لوگ اس پر متفق ہو سکیں یہ تو ایک منفی قدم ہے۔ اس کے مُدعی زیادہ سے زیادہ اس کو یہ حیثیت دیتے ہیں کہ مذہبی اختلافات سے بچنے کے لئے اجتماعی زندگی کو "دین" کے دائرہ اختیار سے باہر نکال لینے کا نام سیکولرزم ہے۔ اس سے انسانوں کو کوئی نقطۂ اتحاد نہیں ملتا، بلکہ ایک دائرہ کے باہر انھیں انتشار فکر کی کھُلی چھٹی مل جاتی ہے اور اگر غور سے دیکھئے تو اس دائرہ کے اندر بھی انتشار پوری قوّت کے ساتھ موجود رہتا ہے اس لئے کہ انسانی ذہن کو مختلف خانوں میں تقسیم کرنا ممکن نہیں۔ اس اجمال کی تفصیل آگے آئے گی۔

غور سے دیکھئے تو یہ صرف خدا پرستی کا نظریہ ہے جو فطرتِ انسانی میں گہری جڑیں پیوست رکھتا ہے، جو سب کو یکساں اپیل کرتا ہے اور جسے اپنانے اور اپنائے رہنے کے لئے اور لوگوں میں بے پناہ جذبہ پیدا کرنے کے لئے صرف اتنی سی بات درکار ہے کہ غلط تصوّرات اور نظریات کا وہ خس وخاشاک دور کر دیا جائے جو مغرب کی الحادی تہذیب نے ہمارے سر لا تھوپا ہے۔ لوگوں میں چاہے، لاکھ مذہبی اختلافات پائے جاتے ہوں لیکن اللہ کو خالق ومالک مان کر اسے عبادت کا حق دار جاننا ایک ناقابل لحاظ اقلیت کے سوا تمام انسانوں کے نزدیک ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ اب حقیقت مبہم ہو کر رہ گئی ہے۔ اس کی حدود واضح نہیں ہیں اور اس کا صحیح تصوّر بھی بمشکل ہی لوگوں کے سامنے ہے لیکن اگر کوئی چیز عام طور پر لوگوں کے نزدیک قابل قبول بن سکتی ہے، اگر کوئی چیز فطرت انسانی سے گہری وابستگی رکھنے کی بنا پر سب سے مطالبۂ تسلیم وانقیاد کر سکتی ہے اور کسی چیز پر لوگ اپنے سارے اختلافات کو، چاہے وہ لسانی یا صوبائی ہوں یا طبقاتی اور قومی، نظر انداز کر کے ایک ہو سکتے ہیں تو وہ یہی "اطاعت الٰہ واحد" کا نظریہ اور اصول ہے۔

اب رہی تیسری خرابی یعنی معاشی ناہمواری اور بدحالی تو اس کے بنیادی اسباب بھی کچھ مختلف نہیں۔ غور کیجئے تو معاشی خوش حالی کا انحصار دو ہی باتوں پر ہے۔ ایک تو یہ کہ لوگ جی لگا کر محنت کریں دوسرے یہ کہ محنت کے حاصل کو انصاف کے ساتھ تقسیم کریں تاکہ تمام افراد بخیر وخوبی زندگی گذار سکیں۔ جب لوگ جی لگا کر محنت کریں گے اور اللہ کی دی ہوئی زمین اور جسمانی صلاحیتوں سے پوری طرح کام لیں گے تو اللہ کی یہ زمین دولت کے انبار لگا دے گی۔ اب تقسیم دولت اگر منصفانہ طور پر نہیں ہوئی اور یہ دولت زیادہ تر چند غیر منصف مزاج ظالم لوگوں

کے ہاتھ میں جمع ہو جاتی ہے تو عوام، بدحالی کا شکار رہیں گے اور اگر اس کی تقسیم فطری اصولوں کے تحت عدل و انصاف کے ساتھ ہوتی ہے تو سماج میں عام خوش حالی کا دور دورہ ہوگا اور لوگ امن و چین کی زندگی گذار سکیں گے۔ تاریخ گواہ ہے کہ عام لوگوں کی بدحالی اور پریشانی کا اصل سبب پیدائش دولت میں کمی نہیں رہی ہے بلکہ دولت کی غیر عادلانہ تقسیم اس کی اصل وجہ رہی ہے۔ ہمارے یا دوسرے ممالک کے معاشی مسائل کا اصل حل پیدائش دولت میں اضافہ نہیں بلکہ دولت کی صحیح تقسیم ہے۔

اب اگر آپ ان دونوں بنیادوں پر غور کریں تو آپ کو نظر آئے گا کہ افراد کے جی لگا کر محنت کرنے کا انحصار اس پر ہے کہ لوگوں میں احساس ذمہ داری کس حد تک ہے اور لوگ انفرادی غرض کی تکمیل سے آگے بڑھ کر اجتماعی مفاد کا کس حد تک پاس و لحاظ رکھتے ہیں۔ پھر دولت کی صحیح تقسیم کا انحصار اولاً تو اس پر ہے کہ لوگ انصاف پسند ہوں اور ظلم و جبر سے بار رہنا اپنا فرض جانتے ہوں اور دوسرے اس پر کہ ملک کی قانون سازی خود کو ان اصولوں کا پابند سمجھتی ہو۔ وہ کسی طبقے ... کی بے جا حمایت نہ کرے، بلکہ اس معاملہ میں اس کے رہنما کچھ بنیادی غیر مبدّل اصول ہوں جن کو کوئی بھی بدل نہ سکتا ہو۔ اس لیے کہ اگر ایسا نہ ہوگا تو، جیسا کہ سرمایہ دار ممالک میں عام طور پر ہوا کرتا ہے، سرمایہ داروں کے ایجنٹ قانون سازی پر چھا جائیں گے اور ایسی قانون سازی کریں گے جو اُن کے حق میں ہوگی اور مظلوم طبقات کے مفاد کے خلاف پڑے گی۔ خود یورپ میں سرمایہ دارانہ نظام نے اسی طرح جنم لیا جس وقت صنعتی انقلاب کے طفیل میں پیدائش دولت میں بے حد و حساب اضافہ ہو رہا تھا غریب مزدوروں کو ۱۲ گھنٹے اور ۱۴ گھنٹے روزانہ محنت کے بعد بھی پیٹ بھر روٹی نہ ملتی تھی۔ پھر سود کے ذریعہ تاجروں اور عوام کا خون چوسا جاتا رہتا تھا۔ اور اسی طرح عرصہ دراز تک اجرتوں کی شرح کم رہی اور عوام کو لوٹنے کے نت نئے طریقے اختیار کئے جاتے رہے۔ وقت کی قانون سازی ان سب کی پشت پناہی کرتی رہی اور وقتاً فوقتاً جو اصلاحات ہوتی رہیں وہ بھی بس اسی قدر جس کہ عوامی طاقت نے مجبور کر دیا۔ آج بھی ان ممالک میں لاتعداد غیر منصفانہ ادارے اور طریقے رائج ہیں لیکن قانون ان کو نہیں روک سکتا اس لئے کہ جمہوریت کی لاکھ ترقی کے باوجود ملک کی قانون سازی ایک محدود اقلیت ہی کے ہاتھ میں رہتی ہے جس کے اپنے مفادات کبھی اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ چونکہ قانون سازی کچھ

متعین اصولوں اور حدود کی پابند نہیں ہوتی لہٰذا دو طبقات میں ایک مستقل کشمکش جاری رہتی ہے اور ہر ایک اس بات کی فکر میں رہتا ہے کہ قانون سازی اس کے مفاد کی زیادہ سے زیادہ رعایت کرے۔

سرمایہ دارانہ نظام کی پیدا کردہ خرابیوں کے حل کے طور پر کمیونزم کو پیش کیا گیا مارکس نے سرمایہ دارانہ نظم معیشت کی اصل خرابی کا ذمہ دار انفرادی ملکیت کے طریقے کو قرار دیا اور قومی ملکیت کو اس کا علاج بتایا۔ اس وقت ہم کمیونزم پر تفصیل سے گفتگو نہیں کر سکتے لیکن اتنی بات تو بالکل واضح ہے کہ مارکس کا یہ تجزیہ غلط تھا۔ خرابی کی اصل وجہ انفرادی ملکیت نہیں بلکہ اخلاق کا فقدان اور انسانی قانون سازی ہے۔ افراد اخلاقی قدروں کو پسِ پشت ڈالتے ہوئے ظلم و زیادتی پر اُتر آتے ہیں اور ملک کا نظام جو انہی افراد پر مشتمل ہوتا ہے اور انسانی قانون سازی کے اصول پر مبنی ہوتا ہے، ظالم طبقے کے مفاد کا نگراں بن جاتا ہے۔ اگر یہ بنیادی خرابیاں دور نہ کی جائیں تو قومی ملکیت بھی کسی طرح صورتِ حال کو بہتر نہیں بنا سکتی۔ قومی ملکیت کا نظام بھی بہرحال افراد ہی کے ذریعہ چلایا جاتا ہے اور اگر یہ افراد بداخلاق اور بد دیانت ہوں تو کوئی چیز انہیں ظلم و جبر کی نئی شکلیں اختیار کرنے سے نہیں روک سکتی اور جن لوگوں کے ہاتھ میں ملک کے نظامِ حکومت کی باگ ڈور ہو گی وہ قانون کو اپنے غلبہ و اقتدار کے استحکام اور اپنے مفاد کی حفاظت کے لئے اسی طرح استعمال کر سکیں گے جیسے کہ سرمایہ دار ممالک میں بورژوا طبقہ کرتا ہے! اس طرح دولت کی تقسیم کے بارے میں کمیونزم سے کچھ زیادہ امیدیں نہیں وابستہ کی جا سکتیں، رہی پیدائش دولت تو کمیونزم نے "ذاتی نفع کی طلب" جیسے بڑے محرکِ عمل کو ختم کر کے اس پہلو سے اپنے کو کمزور کر لیا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کے پاس کوئی ایسا تصوّر بھی نہیں جو فرد میں احساس ذمہ داری پیدا کر سکے۔ ہاں عارضی طور پر قوم و ملک کی ترقی اور دوسری اقوام سے جنگ و جدال کو محرک بنایا جا سکتا ہے لیکن تا کجے۔

پھر کمیونزم اگر ہمارے معاشی مسئلہ کو کسی حد تک حل کر بھی دیتا تو بھی وہ کسی طرح قابلِ قبول نہ ہو سکتا تھا اس لئے کہ اخلاق، معاشرت اور سیاست پر وہ جو اثرات ڈالتا ہے ان کو کسی طرح بھی گوارا نہیں کیا جا سکتا۔ اخلاقی قدروں کی پامالی اور خاندانی نظم میں انتشار پیدا کرنے کے بعد معاشرتی زندگی کا جو نقشہ بنتا ہے اس کا تصوّر کیجئے۔ اس معاشرت کے ساتھ کمیونزم ہمیں ایک ایسا سیاسی نظام دیتا ہے جس میں

افراد کی آزادی سلب کرلی جاتی ہے۔ اظہار خیال اور تنقید کی گنجائش نہیں ہوتی اور ارباب اقتدار کی کسی خرابی کو دور کرنا ایک انتہائی مشکل کام ہوجاتا ہے۔ ایسی ڈکٹیٹر شپ اور اتنی ہمہ گیر کنٹرول رکھنے والی کلیت پسندانہ ریاست دو روٹیوں کے بدلے وہی لوگ قبول کرسکتے ہوں جو یا تو عقل وخرد سے عاری ہوں یا معاشی بدحالی کے کسی دوسرے حل کو ممکن ہی نہ سمجھتے ہوں۔

علاج کی طرف ——— خدا پرستی

واحد علاج۔ خدا پرستی اپنے سماج کے ان اہم ترین مسائل اور بگاڑ اور بدتری کی ان بھیانک شکلوں کا جائزہ لینے اور ان کے اسباب کا تجزیہ کرنے کے بعد یہ بات بالکل ہمارے سامنے آچکی ہے کہ ان حالات کا علاج اگر ہوسکتا ہے تو خدا پرستانہ طرز فکر اور خدا پرستانہ طرز عمل ہی سے ہوسکتا ہے۔ جو چیز ہمیں ہلاکت کی طرف جانے سے روک سکتی ہے اور ہمیں سدھار اور بناؤ کی راہوں پر لگا سکتی ہے وہ صرف خدا پرستی ہے۔ آگے چل کر ہم ذرا اور تفصیل سے جائزہ لیں گے کہ خدا پرستی ہمیں کیا کچھ عطا کرسکتی ہے اور اس کو اس کے حقیقی ہمہ گیر اور جامع تصور کے ساتھ اختیار کرلینے کے کیا ثمرات ہوسکتے ہیں جو ہمارے سماج کو ملیں گے لیکن بہتر ہو کہ یہاں ٹھہر کر آپ ذرا ایک دوسری حیثیت سے بھی اس معاملہ پر غور کرلیں۔

خدا پرستی۔ فطرت کی پکار اور عقل کا تقاضا حقیقت یہ ہے کہ خدا پرستی تو ہماری فطرت کی پکار ہے۔ اب اگر یہ ہمارے سارے مسائل کا بھی حل ہے، تو یہ اس کے حق میں ایک بات کا اضافہ ہے۔ یہ اس کا ایک اور (credit) ہے لیکن اس سے قطع نظر خدا پرستی تو ہماری فطرت کی پکار ہے۔ اور یہی بات اس کے قابل قبول بلکہ واجب الاختیار ہونے کے لئے کافی ہے، سوچئے تو ہم سب انسان ہیں ہمیں اللہ تعالیٰ نے بنایا ہے، بنایا ہی نہیں بلکہ طرح طرح کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ یہ ہوا جس سے آپ کو صرف آکسیجن ہی نہیں ملتی بلکہ جس کے چلنے سے آپ محفوظ بھی ہوتے ہیں، یہ پانی جو آپ کی غذائی ضرورت ہی کی نہیں تکمیل کرتا بلکہ آپ کے ذوق طہارت ونظافت کا بھی مددگار اور معاون ہے، یہ آسمان جس پر کبھی گھنگھور گھٹائیں چھاتی ہیں اور اس میں

چمکدار ستارے آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے ہیں اور یہ زمین جو ہمیں رہنے کی جگہ بھی دیتی ہے غلّہ اور کھانے کمانے کی دوسری چیزیں بھی پیدا کرتی ہے اور پھر اپنے سینے سے معدنیات کے خزانے نکال نکال کر ہمیں تمدن و ترقی کی بلند منازل تک بھی پہنچاتی ہے ــــ یہ بے شمار نعمتیں سب کی سب اسی خدا کی تو کرم فرمائیاں ہیں جس کی کائنات میں ہم بستے ہیں۔ کیا اس خدا کا شکر ادا کرتے ہوئے اس کی ہدایات کے آگے سر جھکا دینے کے علاوہ بھی کسی روش کا ہم تصوّر کر سکتے ہیں؟ کیا خدا کی اس دنیا میں رہنے اور اس کی نعمتوں سے مستفید ہونے کے ساتھ ساتھ ہم اس کی نافرمانی کرنے اور اپنی من مانی راہ چلنے کی بھی سوچ سکتے ہیں! مجھے یقین ہے کہ عقل اور انسانیت رکھنے والا کوئی انسانی گروہ اس بات پر ہاں نہیں کر سکتا۔ اس بات پر ہاں جب ہی کہی جا سکتی ہے جب انسان اپنی انسانیت سے ہاتھ دھو چکا ہو۔ اس کی فطرت مسخ ہو چکی ہو۔ اس کی عقل کج ہو گئی ہو اور اس نے اس مسخ شدہ فطرت اور ٹیڑھی سمجھ سے یہ طے کیا ہو کہ وہ احسان مندی اور شکر کی بجائے نمک حرامی اور کفر کی روش پر چلے گا۔

آپ خود ہی سوچئے کیا خدا پرستی کی روش کو دیدہ و دانستہ چھوڑنا کسی طرح معقول قرار دیا جا سکتا ہے؟ کفر اور لادینیت اگر کسی صورت میں معقول ہو سکتی ہے تو وہ یہی کہ خود خدا ہی کے وجود کا انکار کیا جائے اور اس بات کو عقل و تجربہ کی روشنی میں ثابت کر دکھایا جائے۔ لیکن آپ جانتے ہی ہیں کہ خدا کا وجود عقل اور فطرت کی روشنی میں ثابت ہے اور جو مختصر سا گروہ وجود خدا کا منکر ہے وہ آج تک اپنے اس انکار پر عقل اور سائنس سے واضح دلائل نہیں لا سکا۔ غور کرنے کی بات ہے کہ جب مخلوقات وجود رکھتی ہیں اور ان کا وجود کسی ثبوت کا محتاج نہیں تو خالق کے وجود کا انکار کیسے ممکن ہے۔ جب کائنات نظم و تدبیر اور حسن و سلیقہ کے ساتھ چلائی جا رہی ہے تو ہم اس کے منتظم و مدبر ایک صاحب حسن و جمال خالق کے وجود کا انکار کس طرح کر سکتے ہیں۔ عام عقلی استدلال اور وجدان سے جس خدا کا وجود ثابت ہوتا ہے سائنس اس کے خلاف کوئی دلیل نہیں دیتی ــــ یہ دوسری بات ہے کہ سائنس کا طریق تحقیق چونکہ تجربہ و مشاہدہ کی حدود کا پابند ہے اور خدا کا وجود کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو ان حدود کا پابند ہو، لہٰذا سائنس اپنی حدود کے اندر رہتے ہوئے، خالص تجربہ و مشاہدہ کے طریقے سے وجود خدا کا ثبوت نہیں پیش کر سکتی۔ لیکن اگر سائنس کے عام طرز تحقیق کو آپ لے کر آگے بڑھیں تو بالآخر خدا ہی تک پہنچیں گے۔ سائنس

کا عام طرز تحقیق یہی تو ہے کہ کسی چیز کے بارے میں پہلے قرائن کی بنا پر ایک مفروضہ HyPOTHESIS) قائم کیا جاتا ہے۔ پھر دنیائے واقعات میں دیکھا جاتا ہے کہ یہ مفروضہ تمام مظاہر و حوادث کی توجیہ (Explana-tion) کامیابی کے ساتھ کرتا ہے یا نہیں اور یہ کہ یہ مفروضہ سائنس کی کسی دوسری ثابت شدہ حقیقت (Fact) سے ٹکراتا تو نہیں۔ اگر ان دونوں آزمائشوں سے کوئی مفروضہ (HyPOTHESIS) گزر جائے تو اسے علمی نظریہ (THEORy) کا درجہ دے دیا جاتا ہے اور اگر یہ علمی نظریہ ایک عرصہ طویل تک تحقیق و تفتیش پر پورا ہی اترتا جائے تو اسے "حقیقت" (Fact) قرار دے دیا جاتا ہے۔
اب یہ ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ ان دونوں آزمائشوں سے اگر کوئی نظریہ کامیابی کے ساتھ گذر کر عرصہ دراز سے قائم و ثابت ہے تو وہ خدا کے وجود کا نظریہ ہے نہ کہ عدم وجود کا۔ عدم وجود کا نظریہ تو کائنات کے سب سے بڑے مظہر "وجود" کی ہی توجیہہ نہیں کرسکتا، دوسرے مظاہر تو الگ رہے، بہر حال نہ تو ان علمی بحثوں کے لئے یہ کوئی مناسب موقع ہے اور نہ ہی یہاں ان کی ضرورت ہے۔ آج بھی دنیا میں وجود خدا کے جو لوگ واقعی منکر ہیں ان کی تعداد انسانی آبادی میں بمشکل ایک فی لاکھ ہوگی خصوصاً ہمارے ہندوستان میں تو یہ تناسب اس سے زیادہ ہرگز نہیں۔

خدا پرستی سے اعراض کی شکلیں

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے اور واقعتاً وہ سوال اہم ہے، یعنی یہ کہ جب سب لوگ اللہ تعالےٰ کے وجود کے قائل ہیں اور اس کو خالق و مالک بھی مانتے ہیں تو پھر خدا پرستی کا یہ ہمہ گیر فقدان کیوں؟ یہ سوال بلاشبہ اہم ہے اور اس کے جواب پر ہماری اگلی بہت سی باتوں کا انحصار بھی ہے لیکن اس کا جواب بہت آسان ہے۔ خدا پرستی سے لوگوں کی دوری کی اصل وجوہ دراصل دو ہی ہیں اولاً تو انسان کی یہ کمزوری کہ وہ ایک چیز کو صحیح بلکہ واجب العمل جان کر بھی اسے عملاً اختیار نہیں کرتا اور ثانیاً یہ کہ لوگوں نے خدا کے وجود کے قائل ہونے کے باوجود طرح طرح کے خود ساختہ نظریوں کی آڑ لے کر اس کو اپنی عملی زندگی سے دور کر رکھا ہے اور اس طور پر مغالطوں اور خود فریبیوں میں مبتلا ہیں۔ ہمارے غور و فکر کے لئے جو وجہ زیادہ اہمیت رکھتی ہے وہ دراصل پہلی نہیں بلکہ دوسری ہے حقیقت یہ ہے کہ اگر ذہن صاف ہو اور انسان ایک بات کا نظری طور پر صدق دل کے ساتھ قائل ہو تو پھر اس میں عملی کمزوریاں ہو تو سکتی

سمجھتے ہیں تو ہمیں اس کی اطاعت پوری زندگی میں کرنی چاہئے۔ کیا وجہ ہے کہ ہم زندگی کے ایک حصّہ میں اس کے شکرگذار اور فرماں بردار بنیں اور دوسرے حصّہ میں اس کی ناشکری کرتے ہوئے علمِ بغاوت بلند کردیں۔ یہ تضاد کسی طرح بھی معقول نہیں قرار دیا جا سکتا۔ یا تو ہمیں سیدھے سیدھے خدا کا انکار کر دینا چاہئے یا کم سے کم یہ کہ اس کے وجود کا اقرار کرتے ہوئے اس کی ناشکری اور اس سے بغاوت کا کھلّم کھلّا اظہار کر دینا چاہئے، ورنہ اگر یہ روش ہمیں نامعقول اور نامناسب نظر آتی ہے اور ہم کسی طرح بھی خود کو اس کے لئے تیار نہیں کر سکتے تو ہمیں اللہ کے شکر اور اس کی اطاعت کو موقع دینا چاہئے کہ وہ پوری زندگی پر پھیل جائے۔ یہ کیا غضب ہے کہ ہم اجتماعی زندگی کے تحت آنے والے زندگی کے بیشتر اور اہم ترحصّے کو تو اپنی عقل و خواہش کے لئے الگ کر لیں اور انفرادی زندگی کے نام سے عبادت وغیرہ میں لگنے والے چند لمحوں یا گھر کے اندر ہونے والی رسموں کی حد تک اپنی زندگی کے ایک حقیر سے حصّے کو خدا کی ان نعمتوں اور کرم فرمائیوں کا جواب قرار دیں جو بلا کسی تقسیم اور تفریق کے ہماری زندگی اور ہمارے ایک ایک لمحہ پر چھائی ہوئی ہیں۔ جو بازار اور اسکول اور پھر مجلس قانون ساز و دستور ساز سب جگھوں پر ہمیں یکساں طور پر بہم پہنچائی جاتی ہیں اور کسی جگہ بھی ہم سے جدا نہیں ہوتی ہیں۔

اور یہ تو معاملہ کا ایک پہلو ہے یہ بھی تو سوچ لیجئے کہ خود زندگی کو بھی کیا الگ الگ خانوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، خود انسانی ذہن میں بھی کیا کوئی ایسی حد بندی کی جا سکتی ہے کہ شکرگذاری اور ناشکری کے لئے الگ الگ جگہیں نکالی جا سکیں ہرگز نہیں، اضداد کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ ہاں ہم بعض ظاہری رسموں کو شکر و اطاعت کے مظاہر قرار دے کر خود کو اسی فریب میں البتہ مبتلا کر سکتے ہیں کہ ہم تھوڑی بہت شکرگذاری اور اطاعت شعاری بھی کر لیتے ہیں، زندگی تو ایک کل ہے ذہن انسانی ایک اکائی ہے وہ یا تو خدائی ہدایات کا پابند ہوگا یا نہ ہوگا کہیں خدا کی ہدایت کو رہنما بنانا، اور کہیں الٰہی ہدایات کو ٹھکرا دینا، ذہن انسانی کبھی اس طرح کی تقسیم پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اور خاص طور پر آج تو اجتماعیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ زندگی میں کوئی گوشہ بھی ایسا نہیں رہا جسے آپ پورے طور پہ پرائیویٹ قرار دے سکیں۔ زندگی کا ہر شعبہ ایک دوسرے سے مربوط اور متعلق ہے ایک انسان جو کچھ کرتا ہے دوسرے پر اس کا اثر پڑتا ہے اور اپنی زندگی کے کسی گوشہ میں اس کا جو طرز فکر و عمل رہتا ہے وہ لازماً زندگی کے دوسرے گوشوں میں اسی کے طرز فکر و عمل کو متاثر کرتا ہے۔ اس طور پہ یہ بات بالکل واضح ہے کہ

انسان اس طرح کی کوئی تقسیم نہیں کرسکتا، اور نہ ہی یہ تقسیم کسی طرح معقول قرار دی جا سکتی ہے۔

مذہب کو پرائیویٹ معاملہ قرار دینے والوں کو یہ بھی سوچنا چاہئے کہ ان کو ایسا کرنے کا حق کس نے دیا۔ کیا دنیا کے بڑے مذاہب خود اپنی یہ حیثیت متعین کرتے ہیں اور اگر ایسا نہیں ہے تو پھر کسی کو اس بات کا کیا حق پہنچتا ہے کہ اللہ کی بھیجی ہوئی ہمہ گیر ہدایات کی حدود متعین کرتا چلے۔ آج جو مذاہب تحریف و ترمیم سے جس قدر محفوظ ہیں اسی قدر وہ اس بات کا پکار پکار کر اعلان کرتے ہیں کہ خدا کی اطاعت انسان کی پوری زندگی میں ہونی چاہئے۔ وہ ایسے قوانین و ضوابط پیش کرتے ہیں جنھیں کسی طرح بھی زندگی کے "پرائیویٹ" معاملات تک محدود نہیں قرار دیا جاسکتا۔ دنیا کے اکثر مذاہب سود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کرنے کی جرأت کرسکتا ہے کہ سود کا تعلق ... انسانی زندگی کے صرف انفرادی پہلو سے ہے۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ سود کو حرام قرار دے کر تجارت کے لئے اخلاقی حدود و ضوابط مقرر کرکے بازی کو حرام قرار دے کر احتکار اور سٹّہ بازی کو ممنوع ٹھہرا کر مذہب دراصل یہ اعلان کرتا ہے کہ معاشی زندگی میں انسان کا طرز عمل الٰہی ہدایات کی روشنی میں متعیّن ہونا چاہئے اور اُسے ان حدود و ضوابط کا پابند ہونا چاہئے اسی طرح کیا پردہ کو ضروری ٹھہرا کر اور نکاح کے طریقہ نیز خاندان کے ادارہ کو محترم قرار دے کر مذہب انسان کی معاشرتی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں نہیں لے لیتا۔ کوئی ہٹ دھرمی پر اتر آئے تو دوسری بات ہے ورنہ یہ ایک کھُلی ہوئی حقیقت ہے کہ مذاہب عالم اپنی تعلیمات کے لحاظ سے انسان کی پوری زندگی، اجتماعی اور انفرادی، کو اپنی رہنمائی کا میدان قرار دیتے ہیں اور کسی طرح کی حد بندی کے قائل نہیں۔ ان گواہیوں کے ساتھ اگر بعض مذاہب کی کتابوں میں ایسے فقرے بھی مل جاتے ہیں جو کسی حد بندی کے لئے وجہ جواز بن سکتے ہیں تو یہ دراصل انسانی تحریف و ترمیم کا ثمرہ ہے اور بآسانی تحقیق کرکے اس بات پر اطمینان حاصل کیا جاسکتا ہے۔ پس مذہب اور دین جو الٰہی ہدایات لاتا ہے وہ انسان کی پوری زندگی کے لئے ہوتی ہیں اور خدا کا بنایا ہوا دین کبھی انسانوں کو اپنی حدود متعیّن کرنے اور اپنے اندر قطع و برید کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔

سیکولرزم خداپرستی کی ضد ہے ہماری ان باتوں کی روشنی میں یہ بات بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ سیکولرزم اور لادینیت خداپرستی کی ضد بھی ہیں۔

اور ساتھ ہی ساتھ نامعقول بھی۔ یہ بات اتنی واضح ہے کہ مزید تفصیل کی ضرورت نہیں محسوس ہوتی لیکن سیکولرزم کے علمبردار اس حقیقت کو ماننے سے بہت گھبراتے ہیں کہ "سیکولرزم خدا پرستی کی ضد ہے" وہ جانتے ہیں کہ خدا پرستی کی ضد کی حیثیت سے کسی چیز کو پہچان لینے کے بعد بھی اسے اختیار کئے رہنا عوام کے لئے تقریباً ناممکن ہے۔ ان کے علاوہ زیادہ تر لوگ تو ایسے ہی ہیں جو اس تضاد کو محسوس نہیں کرتے اور مختلف تاویلوں سے اپنے کو یہ سمجھا لیتے ہیں کہ خدا پرستی کے ساتھ سیکولرزم بھی نبھ سکتا ہے۔ یہ غلط فہمی بہت آسانی سے دور ہو سکتی ہے اگر ہم یہ دیکھیں کہ کامل خدا پرستی اور سیکولرزم کے تقاضے کس طرح عملی زندگی میں باہم ٹکراتے ہیں۔ ان کا یہ ٹکراؤ اتنا واضح ہے کہ ہر آدمی انھیں محسوس کر سکتا ہے مثال کے طور پر نظام تعلیم کو لے لیجئے خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ ماں کی گود، پرائمری اسکول، اسکول، کالج اور یونی ورسٹی، ہر جگہ جو چیز سب سے زیادہ اہمیت کے ساتھ سکھائی، سمجھائی اور ذہن نشین کرانی چاہیے وہ یہ کہ انسان خدا کا بندہ ہے، اسے ہر آن خدا کی اطاعت کرنی ہے اور اس کے بھیجے ہوئے ضابطۂ ہدایت کو اپنا لائحہ عمل بنانا ہے۔ اس بنیاد کو تعلیم کے پورے نظام میں روح کی طرح سرایت کئے ہوئے ہونا چاہئے، اور پھر جو بات طالبِ علم کو سب سے پہلے بتانی چاہئے وہ یہ کہ خدا نے کیا ہدایات بھیجی ہیں اور ان پر کس طرح عمل کرنا ہے۔ لیکن کیا ایک سیکولر نظام اس کو اپنی تعلیمی پالیسی قرار دے سکتا ہے؟

دیکھئے یہاں دونوں کے تقاضے بالکل ٹکرا گئے۔ اور آگے بڑھئے، کامل خدا پرستی کا اوّلین تقاضا یہ ہے کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی کو کنٹرول کرنے کے لئے جو قانون سازی ہو وہ ہدایات الٰہی کی پابند اور اس کی حدود کے اندر ہو، نیز یہ کہ جو قوانین اللہ تعالٰے دیتا ہے انھیں پورا کا پورا نافذ کیا جائے۔ ابھی ابھی خدا پرستی کی جو تشریح ہم نے کی ہے اس کی روشنی میں اس بات کے تقاضائے خدا پرستی ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن کیا سیکولر نظام ایسا کرنے کی سوچ بھی سکتا ہے۔ ہرگز نہیں سیکولرزم کا تو مطلب ہی یہی ہے کہ کوئی بات محض اس لیے قانون نہیں بن سکتی کہ اللہ نے اس کو ایک قانون کی حیثیت سے بھیج دیا ہے اس کے برعکس کسی بات کے حق میں مجلس قانون ساز میں تقریر کرتے وقت آپ اس بات کو ایک ادنیٰ دلیل کے طور پر بھی نہیں پیش کر سکتے۔ ظاہر ہے کہ خدا پرستی اسے نہیں کہتے۔ انسان

الہٰی ہدایات و قوانین کا تو محتاج ہی اسی لئے ہے کہ اس کی عقل و خرد تمام مصالح کا احاطہ نہیں کر سکتی۔ اس کے علوم اس بات کی قدرت نہیں رکھتے کہ وہ بنیادی امور میں اس کی صحیح رہنمائی کر سکیں۔ اسی محدودیت اور بے چارگی کی وجہ سے انسان الہٰی ہدایت کا محتاج ہے اگر ہم نے قانون سازی کی بنیاد صرف عقل و خرد کو قرار دیا تو گویا ہم نے اس احتیاج کو جھٹلایا، اور خدا پرستی کا انکار کیا۔

اب یہ واضح ہو گیا کہ خدا پرستی رہنما ہو گی تو عملی زندگی کا نقشہ کچھ اور ہی ہو گا۔ قانون سازی کا مزاج بھی ایک خاص طرح کا ہو گا اور ملک کا نظام تعلیم بھی ایک مخصوص شکل اختیار کرے گا۔ پھر پریس۔ ریڈیو۔ اور سینما وغیرہ تمام ذرائع نشر و اشاعت ایک دوسری ہی سمت میں چلنا اور چلانا چاہیں گے۔ لادینیت کی راہ الگ ہے۔ اس کی روشنی میں جو قانون سازی ہوتی ہے اس کے طور طریقے جدا ہیں، اس کے زیر اثر رہ کر نظام تعلیم، پریس، سینما، ریڈیو سبھی ایک بالکل مختلف رخ اختیار کرنے پر مجبور ہوں گے۔

کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ ساری باتیں نظری طور پر ہی کرتے رہیں۔ آپ آج کے ہندوستان میں عملاً یہی نقشہ دیکھ رہے ہیں۔ ملک کی قانون سازی۔ نظام تعلیم اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت اور ان سب کے نتیجہ میں اجتماعی زندگی کے مختلف پہلو سب آج خدا پرستی کے تقاضوں کو چھوڑ کر ایک الگ ہی راہ پر چل پڑے ہیں۔ یہاں موقع نہیں کہ ہم تفصیل سے اس راہ اور خدا پرستی کی راہ کے ایک ایک فرق کو واضح کریں اور افتراق کے مضر پہلو آپ کے سامنے رکھیں، یہاں یہی کچھ ہو سکتا تھا کہ ہم خدا پرستی کے فقدان کے نتیجہ میں پیدا ہونے والی خرابیوں کا جائزہ لیں اور اس حقیقت کو سمجھنے کی کوشش کریں کہ یہ سارا فساد لادینی طرز فکر کا ہے۔

سیکولرزم کے حق میں بعض تاویلات

لیکن اب ہمارا وہ سوال اور زیادہ اہم ہو جاتا ہے جس کے سلسلہ میں ہم اب تک سوچتے رہے ہیں، یعنی یہ کہ جب سیکولرزم ایک نامعقول اور مہلک طرز فکر و عمل ہے تو پھر ہندوستانی سماج نے اسے کیوں اختیار کر رکھا

(بقیہ بر صفحہ ۶۲، ۶۳)

ہے! بلاشبہ اس کا جواب ابھی باقی ہے، ابھی ہمیں ان نام نہاد فوائد کا جائزہ لینا ہے جنھیں سیکولرزم کی تاویل کرنے والے گناتے ہیں۔ یہ لوگ پہلے تو تاویل کے ذریعہ یہ ثابت کرنا چاہتے ہیں کہ سیکولرزم خدا پرستی کی ضد نہیں، اس کو یہ عموماً اس طرح ثابت کرتے ہیں کہ سیکولرزم حکومت کی پالیسی کے طور پر اختیار کیا گیا ہے نہ یہ کہ ہر ہر فرد کو "سیکولر" بنایا جا رہا ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہ حکومت کیا بلا ہے۔ کیا اسے سماج کے افراد سے کوئی" واسطہ نہیں؟ پھر جب یہ حقیقت ہے کہ حکومت کی سرگرمیاں دراصل سماج کے افراد کی عملی زندگی کی اکثر و بیشتر سرگرمیوں کا مجموعہ ہیں تو اس مغالطہ اور فریب سے کیا حاصل۔ بہر حال اس سلسلہ میں ہم کافی گفتگو کر چکے ہیں

اسی طرح کی ایک دوسری تاویل بھی کی جاتی ہے اور یہ کہ حکومت کی پالیسی کے طور پر سیکولرزم کو اختیار کر لینے کے بعد بھی مذہب کی اچھی تعلیمات کو قانون سازی پر اثر انداز ہونے کا پورا پورا موقع حاصل رہتا ہے اور وہ اس طرح کہ الیکشن میں ایسے افراد کو منتخب کرنے کی کوشش کی جائے جو خدا پرست ہوں اور اس طور پر ایسے افراد کے ذریعہ مجلس قانون ساز کے کام پر مذہب اور خدا پرستی کا اثر ڈالا جائے۔ لیکن یہ بات مختلف وجوہ سے انتہائی مہمل قرار دی جانے کے لائق ہے۔

اولاً تو یہی بات انتہائی نامعقول ہے کہ اگر ملک کے عوام خدا پرستی کے قائل ہوں تو وہ سیدھے سیدھے یہ کرنے کی بجائے کہ اپنی دستور سازی وقانون سازی کو الہٰی ہدایات کا پابند بنا دیں، یہ الٹا طریقہ اختیار کریں جو کبھی مطلوبہ نتائج سامنے نہیں لا سکتا۔

ثانیاً یہ کہ خدا پرستی یہ ہے کہ آپ کسی فرمان الہٰی کو اس کے اللہ کا حکم ہونے کی وجہ سے ہی قابل قبول سمجھیں اور اس کے آگے سر طاعت خم کر دیں اور جیسا کہ ہم نے ابھی اشارہ کیا تھا ہم ناقص عقل اور محدود علم رکھنے والے انسانوں کے لئے یہی روش مناسب ہے اور اس کے علاوہ دوسری روش یعنی یہ کہ ہم اپنا ضابطہ حیات خود وضع کریں، غلط اور اپنے نتائج کے اعتبار سے انتہائی مہلک ہے، سیکولر نظام کی قانون سازمشنری نے اگر کوئی ایسا قانون بنایا جسے مذہب نے بھی قانون قرار دیا ہو

تو اس کی بنیاد عقل و تجربہ پر ہوگی - اور جیسا کہ ہم ابھی کہہ چکے ہیں، کوئی وہاں کسی مجوزہ قانون کے حق میں یہ بات تائیداً بھی نہیں پیش کر سکے گا کہ یہی حکم اللہ تعالٰے نے بھی دیا ہے جو واجب الاطاعت ہے - ظاہر بات ہے کہ جب انحصار انسانی عقل ہی پر رہا تو چند امور میں اتفاق سے اگر رائے جمہور اور حکم الٰہی میں توافق ہوگیا تو ہوگیا لیکن کہیں نہ کہیں تو دونوں کی راہ الگ ہو ہی جائے گی - کیا تاریخ انسانی کا طویل تجربہ یہ حقیقت وانکشاف نہیں کرتا کہ عقل و خواہش کی قانون سازی الٰہی ہدایت سے الگ بلکہ اس کے برعکس سمت میں ہی سفر کرتی ہے ؟

ثالثاً یہ کہ ایک سیکولر نظام میں اس بات کی توقع رکھنا بالکل فضول ہے کہ انتخابات میں خدا پرستی اور دینی فکر و عمل کو بھی معیار بنایا جا سکے گا - سیکولر نظام اپنے نظام تعلیم اور دوسرے ذرائع نشر و اشاعت کے ذریعہ جلد ہی ایک ایسی فضا بنا دے گا جس میں بجز سیکولرزم کے کسی اور فکر کا سیاسی میدان میں پنپنا مشکل ہو جائے گا اور نتیجۃً سیاسی جماعتوں کی تنظیم کی بنیادیں اور انتخابات میں معیارِ ردّ و قبول سبھی کچھ سیکولر اور مادی طرز فکر ہی بن کر رہے گا۔

ان تاویلات کی کمزوری بالکل واضح ہے، یہ محض دھوکے کی باتیں ہیں تاکہ عوام میں کبھی کبھی خدا پرستی کی طرف جو میلان پیدا ہوتا ہے - وہ ان مغالطوں کا شکار ہو کر دب جائے - آئیے اب ان برکتوں کا بھی جائزہ لے لیں جو سیکولرزم کی طرف منسوب کی جاتی ہیں - (باقی آئندہ)

بقیہ "ہند میں اسلام" :- جو اسلام کا حقیقی سرچشمہ ہیں تشبث و انبساط کرنا بالکل چھوڑ دیا تھا بس اسلام کا صرف فقہی نقطہ نظر باقی رہ گیا تھا - روح اسلام فنا ہوگئی تھی اکثر علماء، مخدوم الملک کی طرح تھے، جو ادائیگی زکوٰۃ سے بچنے کے لئے سال کے آخر میں اپنی تمام جائداد اپنی بیوی کے نام منتقل کر دیتا تھا اور سال آئندہ پوری پوری مدت گزرنے سے پہلے پھر واپس لے لیتا - علماء مسائل فقہ کی موشگافیوں میں منہمک رہتے تھے - اور معمولی سے معمولی اختلافات سخت جھگڑے پیدا کرنے کے لئے کافی ہوتے تھے - وہ جاہ پرست تھے اور ہمیشہ دنیاوی اقتدار حاصل کرنے کی

جلد ۱۳
شمارہ ٤

جنوری ۱۹۵۵ء
ربیع الثانی ۱۳۷٤ھ

سالانہ پانچ روپئے

فی پرچہ آٹھ آنے